اسلام، چوتھی صدی کا اسلام اور بیسویں صدی کا اسلام اپنا کوئی الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ اسلام تو ایک ہی رواں دواں دریا کے مانند ہے، جس میں پانی کے نئے دھارے ملتے بھی رہتے ہیں اور اس کی نوعیت اور سمت پھر بھی ایک جیسی ہی رہتی ہے خواہ ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، مالک، غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ کا تصورِ اسلام ہو یا اقبال اور قائداعظم کا تصور۔ یہ سب اسی ایک اسلام کے علَم بردار تھے اور قرآن وسنت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے باہر یا اس میں غیراسلام کی آمیزش کے رُونما ہونے والے کسی نظرثانی شدہ اسلام کے نہ قائل تھے اور نہ داعی۔ ان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہوسکتا کہ ان کے اسلام اور مُلّا کے نام نہاد اسلام کو دست و گریباں کیا جائے۔ اور اقبال اور قائداعظم کا نام لے کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت سے فرار کی راہیں تلاش کی جائیں۔

علامہ اقبال کی تو پوری زندگی کا مشن اور پیغام ہی یہ تھا کہ:

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست ۔۔۔ اصلِ سُنت جز محبت ہیچ نیست
ملّت از آئینِ حق گیرد نظام ۔۔۔ از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے ۔۔۔ ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
با تو گویم سّرِ اسلام است شرع ۔۔۔ شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات ۔۔۔ شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت ۔۔۔ قوم را رمزِ بقا از دست رفت

(رموزِ بے خودی)

سچّا علم، شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور سنتِ رسولؐ کی بنیاد محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ملّت کو بھی شریعت ہی سے نظام حاصل ہوتا ہے اور پختہ نظام اسے دوام عطا کرتا ہے۔

شریعت کے علم ہی سے (عمل پر) قدرت حاصل ہوتی ہے: یہ عصا (قوت کا نشان) اور یدِ بیضا (نورِ ہدایت) بھی حاصل ہوتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کا راز ہے ہی 'شرع' کا آغاز اور 'شرع' ہی کا انجام۔

حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہی دینِ فطرت ہے، اور شرعِ محمدیؐ آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔

جب حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار (یعنی شریعت) ہاتھ سے نکل گیا تو قوم رمزِ بقا سے بھی محروم ہوگئی۔

رہے قائداعظمؒ اور ان کے حقیقی رفقا (نوابزادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ) تو تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد کم از کم ڈیڑھ دوسو ایسے واضح بیانات تو صرف قائداعظمؒ کے موجود ہیں، جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن، اسوۂ رسولؐ، اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقاریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور تمام حقائق کے سامنے آجانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدنیتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائداعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اُٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہوسکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آسکتی۔

کراچی میں ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملّت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینۂ ملّی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم انڈیا کے سفینۂ ملّی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت کتاب قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، ایک قبلہ اور ایک قوم!

سرحد [خیبر پختونخوا] مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے ۱۹۴۵ء میں دیا، وہ یہ تھا:

پاکستان کا مطلب صرف آزادی وحُریت کا حصول نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریے کا تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے اور بیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

بہ جز ان لوگوں کے جو بے خبر ہیں ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآنِ مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر و بالاتر اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی بھی، معاشی و معاشرتی بھی، دیوانی بھی، فوج داری بھی، تجارتی بھی، عدالتی بھی اور تعزیری بھی___ یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو با قاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔

سبّی دربار کے موقعے پر ۱۲فروری ۱۹۴۸ء کو قائد نے عہد کیا:

میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملاتِ زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آیئے! ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچّے اسلامی اصولوں اور تصورات پر استوار کریں۔ خدائے قادر و مطلق نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام اُمور میں ہمارے فیصلے بحث وتمحیص اور مشاورت کی راہ نمائی میں ہوں۔

ہمیں بتایا جائے کہ قرآن وسنت کی واضح شاہراہ اور اسلام کے ضابطۂ قانون سے ہٹ کر اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اسلام کون سا ہے؟ یہ ان دونوں بزرگوں پر تہمت اور خلط مبحث کی ایک شرم ناک کوشش ہے۔ شریعت میں کوئی ابہام نہیں اور ہر مسلمان اس شریعت کا علَم بردار اور طالب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی امانت کی شکل میں دی ہے۔ شریعت جو ہماری آزادی، دنیوی فلاح اور اُخروی کامیابی کی ضامن ہے، جو تمام انبیا کی سنت رہی ہے اور جسے اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد عربیؐ نے انسانیت تک پہنچایا اور آج جس کی امین اُمت مسلمہ ہے۔ کامیاب اب وہی ہوگا جو اس راستے پر گامزن ہو:

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصّہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ

انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف ۷:۱۵۷)

اسلامی قانون کی بنیادیں

شریعت اور اس کے نفاذ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نوعیت اور حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جو فرق شریعت یا اسلامی قانون اور مغربی قانون میں ہے، اسے نظر میں رکھا جائے۔ لغت کے اعتبار سے 'شرع' اور 'شریعت' کے معنی راستے کے ہیں۔ پرانے زمانے میں گھریلو استعمال کے لیے پانی، محلے یا دیہات کے کنویں، تالاب، نہر یا چشمے وغیرہ سے لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا، جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستے کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔ گویا وہ سیدھا، کشادہ اور واضح راستہ جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرے اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔

اصطلاحی اعتبار سے 'شریعت' سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا اور جو دین کے احکام اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور انسانی زندگی کی ان اصولوں کے مطابق عملی تشکیل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن و سنت اس شریعت کے اصل اور بنیادی ماخذ ہیں۔ اس کے ایک حصّے کا تعلّق عقائد، افکار اور احساسات سے ہے اور دوسرے کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے۔ فقہ یا اسلامی قانون، شریعت کے اس حصّے کا نام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی تشکیل سے بحث کرتا ہے۔ فقہاے کرام 'فقہ' کی یہی تعریف کرتے ہیں: ''فقہ وہ علم ہے، جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے''۔

شریعت انسان کی عملی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے احکام جہاں ایک طرف امر و نہی، حلال و حرام، مستحب اور مکروہ کی نشان دہی کرتے ہیں،

وہیں حدود کی اس صف بندی کے ساتھ ساتھ مباح اور انسانی آزادی کے میدان کو بھی واضح اور نمایاں کردیتے ہیں۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہر دور میں اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے نئی قانون سازی کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

شریعت کے صرف ایک حصے کا نفاذ ہر فرد اور ادارہ اپنی ذاتی مرضی اور پیش قدمی (initiative) کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس طرح ایک خودکار نظام (self-executing system) کے ذریعے شریعت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رچی بسی ہے۔ عبادات و مناکحات میں معاملات کا ایک بڑا حصہ آجاتا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک حصہ وہ ہے، جسے نافذ کرنے کے لیے معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس کے لیے آج کے دور میں دستور، قانون، ریاستی مشینری اور ضابطۂ کار اور عدالتی نظام کو شریعت کے مقاصد اور احکام کا خادم اور کارندہ بنانا ضروری ہے۔

اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی، نظریاتی اور روحانی قانون ہی نہیں بلکہ ملکی اور عدالتی قانون بھی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور مذاہب میں مذہبی قانون اور ملکی اور عدالتی قانون میں فرق کیا گیا ہے۔ مذہبی قانون بالعموم فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا گیا ہے اور اس کے نفاذ کو بھی اس کے فہم و ارادے اور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا۔ ریاستی اور عدالتی قانون صرف دنیاوی معاملات سے متعلق رہا اور اس کا انحصار رسم و رواج، بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدر یا مقننہ کے فیصلے اور عدالت کے فیصلے کی نظیر پر رہا۔ اسلامی قانون میں وحدت، ہم آہنگی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ قانون محض عبادات اور اللہ اور بندے کے تعلق تک محدود نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تعلق انسانوں سے اور فرد کا معاشرے، اجتماع اور ریاست سے تعلق بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہے۔ اسلام کا قانون شخصی، معاشی، دیوانی، تعزیری، بین الاقوامی تمام دائروں پر محیط ہے۔ یہ عبادات سے لے کر خاندانی زندگی، معاشی تگ و دو، عمرانی معاملات، جرم و سزا، جنگ و صلح، غرض ان سب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے یہ ہر مسلمان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اس پر عمل اس کے ایمان اور عقیدے کا تقاضا ہے۔ اس لیے قانون محض جبر اور قوتِ قاہرہ کی علامت نہیں،

بلکہ ایمان کا تقاضا، دل کی پکار، زندگی کی آرزو اور اجتماعی زندگی کا ادب بن جاتا ہے۔ اس کا نفاذ صرف ڈنڈے اور پولیس کے ذریعے نہیں، بلکہ ضمیر کی آمادگی اور رب کی طاعت گزاری کے جذبے سے عبارت ہے۔ بلاشبہہ پولیس اور عدالت کا بھی ایک مقام ہے، لیکن جو چیز اسلام کے قانون کو منفرد درجہ دیتی ہے، وہ اندر کی آواز اور باہر کے قانون کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو تقویت دینے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون پر پولیس کے پہرے اور مخبروں کے خوف سے کہیں زیادہ ضمیر کی خلش اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے عمل ہوا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہاؤں میں بھی اس پر عمل درآمد کا جذبہ ویسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا دن کی روشنی اور محتسب کی موجودگی میں۔ اور جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ ہی نہیں بلکہ پاکی کے حصول کے لیے 'مجرم' خود سزا کا طالب بن جاتا ہے۔

جہاں اسلامی قانون کی یہ روح ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت اپنے نفاذ کو محض ضمیر اور فرد کے ذاتی جذبے پر نہیں چھوڑتی، بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کی شیرازہ بندی کے واضح احکام دیتی ہے، نظامِ امر قائم کرتی ہے، انتظامی مشینری وجود میں لاتی ہے، پولیس اور عدالت کے نظام کو قائم کرتی ہے، اور اس طرح اندرونی قوت اور جذبے کی تکمیل بیرونی قوت اور نظام کے ذریعے کرتی ہے۔ ریاست اپنے تمام اداروں کے ذریعے ایک طرف تلقین، تعلیم اور بہتر نمونے کا اہتمام کرتی ہے تو دوسری طرف ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعے قانون توڑنے والوں کی گرفت اور معاشرے کو جرم اور ظلم سے پاک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ دین اور ریاست ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ سیکولر ریاست اور اس کے تمام ادارے دین کی رہنمائی سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین ریاست اور معاشرے کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حضرت عثمانؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

> اسلام ایک بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور حکومت ایک نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ کمزور رہتی ہے اور گر جاتی ہے، اور اگر کسی عمارت کا کوئی محافظ اور نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کو لوٹ لیا جاتا

ہے یا اس پر دوسرے قابض ہو جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ:

- شریعت پوری زندگی کے لیے راہِ عمل ہے۔
- قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے احکام ہی مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔
- یہ شریعت زندگی کے تمام اُمور پر حاوی ہے۔
- دنیوی قوانین کی طرح یہ محض ریاست کی قوتِ قاہرہ کے آگے سرِتسلیم خم کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ قانون، ایمان و ضمیر کی پکار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- اندرونی پہل قدمی یا داعیہ کے ساتھ ساتھ ریاستی، انتظامی اور عدالتی نظام کا خود شریعت کے ماتحت ہونا اور اس کے نفاذ کے عمل میں شرکت اور معاونت کے لیے مثبت اور مؤثر کردار ادا کرنا، اس نظام کا حصّہ ہے۔
- شریعت کے نفاذ کا عمل ایمان اور ضمیر کی بیداری، تعلیم و تلقین کے نظام، معاشرے کے آداب و روایات اور قانون کی قوت، ان سب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ نہ محض اخلاقی تلقین اور نہ محض جبر و قوت کا استعمال۔

مندرجہ بالا عوامل کا ساتھ ساتھ مؤثر ہونا شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔

یہ عمل ہر فرد سے دل کی گہرائیوں سے اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت، ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے بھی لازم کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تلقین اور اچھی مثال کے ساتھ ساتھ نیکی کا حکم اور برائیوں کے روکنے کا کام انجام دیں۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزے کا اہتمام ___ بلکہ نماز تو ہے ہی اس لیے کہ بُرائیوں سے روکے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ۔ العنکبوت ۲۹:۴۵)۔ اور روزے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ متقی بنیں اور قانون کی پاس داری کریں (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ)۔

ریاست کا مطلوبہ کردار

شریعت کے نفاذ کا کام بڑا منفرد اور بابرکت ہے۔ اس میں قانون اور اس کی حقیقی اسپرٹ دونوں کا ساتھ ساتھ اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل میں فرد، عوام، نظامِ تعلیم، ذرائع ابلاغ، اجتماعی اداروں اور حکومت سب کی شرکت ضروری ہے۔ البتہ دو وجوہ سے حکومت کا کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

- اولاً، آج کی ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے جو ملک اور معاشرے کے وسائل کے بڑے حصّے پر تصرف کے اختیارات رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ وسائل شریعت کے تابع اور اس کے نفاذ کے لیے استعمال نہ ہوں تبدیلی نہیں آ سکتی۔
- ثانیاً، مسلم معاشرہ صدیوں سے انتشار، اضمحلال اور غلامی کے بعد نئی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرداں ہے۔ صدیوں میں جو ادارے قائم ہوئے تھے اور جو اسلامی نظام کے لیے لنگر کا کام کر رہے تھے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ تعلیم کا ایک لادینی نظام دو صدیوں سے قوم پر مسلط ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیفیت واقع ہوگئی ہے جسے علامہ محمد اقبالؒ نے یوں ادا کیا تھا ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غیر اسلامی اور مغربی دنیا سے درآمد شدہ ادارے اور انتظامی دروبست مسلم معاشرے پر بزور ٹھونسے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرد کی کوششوں کے ساتھ معاشرہ، ریاست اور اس کے تمام ادارے ظلم اور باطل سے نجات اور حق اور معروف کے قیام میں مکمل طور پر شریک نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انفرادی کوششیں بارآور نہیں ہو رہیں۔ نجی طور پر خیر کے فروغ اور بدی کے مٹانے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے اور اس کے اچھے اثرات بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر مطلوبہ تبدیلی کے لیے وہ کافی نہیں۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ میں اس کش مکش اور اس کے بُرے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کو اس تناقض (contradiction) اور تصادم سے پاک کیے بغیر ہم اپنے انسانی اور مادی وسائل کو صحیح صحیح استعمال

نہیں کرسکتے اور مطلوبہ نتائج رُونما نہیں ہوسکتے۔

آج مسئلہ صرف انفرادی خطا اور بے راہ روی نہیں اجتماعی فساد اور منظم ظلم ہے۔ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ گویا زمین و آسمان بگاڑ اور فساد سے بھر گئے ہیں (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ۔ الروم ۳۰:۴۱)۔ ان حالات میں اجتماعی قوتوں کو تعلیم و تلقین، مظلوم کی دادرسی، حق دار کو حق پہنچانے اور ظلم اور فساد دُور نہیں ہوجاتے، غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوتا، مجبور اور مظلوم قوی نہیں بن جاتے اور منہ زور اور ظالم قابو میں نہیں کردیے جاتے___ شریعت کے اہداف حاصل نہ ہوسکیں گے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس کی اصلاح کے لیے ریاست اور اس کی اجتماعی قوتوں کو اسلام کے لیے مسخر کرنا ضروری ہے، تاکہ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے لیے انصاف اور عدل قائم ہوسکے (لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ الحدید ۵۷:۲۵)۔

نفاذِ شریعت کی راہ میں اصل رکاوٹ

سوال یہ ہے کہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں ہوپاتی؟ اصل کمی، کسر اور بگاڑ کہاں ہے؟ شریعت کے نفاذ کی راہ میں اصل رکاوٹیں کیا ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم نے اُوپر نشان دہی کی شریعت نے اپنے نفاذ کے لیے چار راستے اختیار کیے ہیں، یعنی: ۱- ایمان اور اندرونی محرک، ۲- تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کا ایک ہمہ گیر نظامِ دعوت، ۳- معاشرہ اور اس کے ادارے، خاندان سے لے کر وقف اور تکافل اجتماعی (رفاہ عامہ) تک، اور ۴- ریاست، قانون اور نظامِ قضا (عدالتی نظام)۔

شریعت چاہتی ہے، یہ تمام کام انفرادی اور نجی سطح پر بھی انجام دیے جائیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ چونکہ ریاست نظامِ امر کا مرکز ہے، اور اللہ کے رسولؐ نے جو وظائف بحیثیت سربراہ انجام دیے، ان کی امین ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کی ذمہ داری دوہری ہے، یعنی خود اپنے دائرے میں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسرے تمام اداروں کی معاونت و سرپرستی، تاکہ فرد اور سول ادارے اپنے اپنے کردار بخوبی انجام دے سکیں۔

اجتماعی دائرے میں نفاذِ شریعت کے لیے جو حکمت عملی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اختیار کی ہے اس میں تنوع اور جدت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے حالات اور مسائل کی

روشنی میں انھوں نے کیا کیا راستے اختیار کیے۔ اصل نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہے جو داعی اور مربی اور معلّم بھی تھے اور سربراہِ مملکت، قاضی اور حاکم بھی۔ آپؐ کی راہ نمائی میں ایک مرکزی نظام کے ذریعے مندرجہ بالا چاروں دائروں کی رہنمائی کا حق ادا کیا گیا اور تاریخ کا روشن اور کامیاب ترین انقلاب رُونما ہوا۔

خلافت راشدہ نے اسی نمونے پر عمل کیا اور نظامِ ریاست و قیادت میں شگاف پڑنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اُموی دور میں اس نمونے کے احیا کی کامیاب کوشش کی۔ بعد کے اَدوار میں یہ مرکزیت اور ہمہ گیری باقی نہ رہی لیکن ہر ہر میدان کے لیے مؤثر انتظام کی کوشش کی گئی اور وقت کے چیلنجوں کی روشنی میں خصوصیت سے ریاست، قانون اور نظامِ عدالت کو اسلام کے مطابق اور شریعت کی حدود میں رکھنے کے لیے نئے تجربات اور نئے انتظامات کیے گئے۔ اس سلسلے کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ اُمت کے معتبر اور معتمد علما کا غیرسرکاری انتظام کے تحت فقہ اور اصولِ فقہ کی تدوین ہے۔ یہ قانون اخلاقی اور اجتماعی عوامی قوت و تائید سے ملک کا قانون بنا اور ایک مؤثر اور آزاد نظام قضا (عدل) کا قیام عمل میں آیا جو شریعت کے نفاذ کا ضامن بن گیا اور خود اربابِ اقتدار بھی اس قانون کے اسی طرح تابع ہوگئے جس طرح باقی انسان۔

اس طرح قانون کا وہ تصور جو دوسری تہذیبوں اور مملکتوں میں 'حکمران کی مرضی' کے مترادف تھا، بالکل بدل گیا۔ اسلامی قلمرو میں 'شریعت' ہی ملک کا قانون بن گئی اور حکمران کی مرضی بھی اس کے تابع ہوگئی۔ یہ قانون کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا تھا، مگر اس کی تشکیل و ترقی میں:

> سرکاری سرپرستی یا نظام سے وابستہ کسی ادارے نے نہیں بلکہ مسلمان اُمت اور اس کے آزاد فکری قائدین، علما، فقہا اور دوسرے اُمور زندگی کے ماہرین نے حصّہ لیا۔ علمی، عوامی اور جمہوری طریقے اور عمل سے یہ قانون وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کرتا رہا۔ اجتہاد، قیاس، استنباط، استحسان، مصالح مرسلہ، استدراک اور اجماع کے ذریعے تازہ فکر، مشاہدہ اور تجربہ، اپنی اصل بنیاد سے تعلق قائم رکھتے ہوئے ترقی کرتا رہا اور ایک ہزار سال تک پوری اسلامی قلمرو کو سیراب کرتا رہا۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کچھ خدا ترس حکمرانوں نے اس قانون کو مرتب اور مدون کر کے اپنی قلمرو میں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ اسلامی قانون کا یہ مزاج ہے کہ وہ محض حکمران کی مرضی یا

ترجیحات یا مقنّنہ (قانون ساز ادارے) کی آزاد مرضی کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام، منشا و مرضی اور قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اصل ماخذ اور ان سے استفادے کے ضوابط کار کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کا نام 'اسلامی قانون' ہے۔

یہی وہ قانون ہے جسے دورِ غلامی سے نجات پانے اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے بعد حاصل کردہ اختیار اور اقتدار کے اس زمانے میں ملّت اسلامیہ پاکستان، نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ برطانوی اقتدار کے نقصانات اور مظالم کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن بیرونی استعمار کا سب سے پہلا ہدف شریعت اور نظامِ قضا (نظامِ عدل) ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے ہی ادارے تباہ کردیے گئے اور آخری حصار، یعنی خاندانی نظام پر بھی مختلف سمتوں سے تابڑتوڑ حملے کیے گئے اور اس عظیم الشان نظام کو تہ و بالا کردیا گیا جو مسلمانوں نے اجتماعی میدان میں قائم کیا تھا۔

حصولِ آزادی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ریاست کا قبلہ درست کیا جائے، اس کے مقاصد اور اہداف کو متعین کیا جائے اور نظامِ قانون کے مطابق اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ برطانوی دور میں تقریباً چار ہزار قوانین حکومت نے اپنے فرمان کے ذریعے مسلط کیے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دستور کی صحیح بنیادوں پر تدوین کے بعد قانون کا جائزہ لیا جاتا۔ ایمان اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق پورے قانونی ورثے کا جائزہ لے کر نہ صرف ان تقاضوں سے متصادم قوانین یا قوانین کے حصوں کو ختم کیا جاتا، بلکہ نئی قانون سازی ہوتی، تاکہ مثبت انداز میں ان دونوں ضرورتوں کے مطابق نیا قانونی نظام اور عدالتی ڈھانچا وجود میں آتا اور اس طرح وجود میں آتا کہ کوئی بحرانی کیفیت نہ پیدا ہوتی۔ مگر اس سمت میں اول تو کوئی کوشش نہ کی گئی، اور اگر کوئی قدم اُٹھایا گیا تو وہ بھی نیم دلی کی تصویر بنا رہا۔

قراردادِ مقاصد اس سمت میں پہلا روشن اور تابناک قدم تھا۔ لیکن اس کے بعد سے آج تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی گردان کی جاتی رہی ہے اور اس سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بار بار نفاذِ شریعت کے مطالبے اُٹھتے ہیں اور حکمران جان بچانے کے لیے چند نمایشی اقدام تو کرتے ہیں لیکن کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت قریب سے

تجربہ صدر جنرل ضیاءالحق مرحوم کے دور میں ہوا۔ ہم نے پورے خلوص سے ان کو اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مربوط اور مکمل پروگرام دیا، مگر اسلام کے لیے مخلصانہ جذبات کے اظہار کے باوجود وہ اس طرف کوئی حقیقی اور دیرپا پیش رفت نہ کرسکے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نفاذِ شریعت کے مسئلے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر مسئلے کی نوعیت کی مناسبت سے عملی اقدامات کا ایک ہمہ جہتی پروگرام مرتب کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے مؤثر اور کارفرما مشینری وضع کی جائے۔

نفاذِ شریعت: بنیادی اقدامات

نفاذِ شریعت کسی ایک اعلان کا نام نہیں۔ یہ تو ایک مسلسل عمل (process) ہے جس کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کو دوسری کا معاون و مددگار اور اس کی تقویت کا باعث ہونا چاہیے، تب ہی مربوط اور دیرپا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ جنرل ضیاء صاحب بار بار کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی ایک چیز بتا دیں جس کے اعلان سے شریعت نافذ ہوجائے، اور میں ہمیشہ ان کو یہی سمجھاتا تھا کہ اگر آپ فی الحقیقت نفاذِ شریعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک اعلان نہیں، تبدیلی کا ایک مفصل اور مربوط پروگرام بنانا ہوگا ــــــ اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

۱- دستور میں قرآن وسنت (شریعت) کی بالادستی کا اظہار اور اسے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مستقل ماخذ قرار دینا۔ نیز دستور میں ایسی ترامیم جو اس کو شریعت سے متصادم اجزا سے پاک کردے۔ دستور کو بار بار ادھیڑنا صحیح نہیں۔ اسی لیے دستور سازی اور قانون سازی میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کا احترام ہونا چاہیے۔ خاص طور پر جب ہم نے تحریری دستور کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہییں۔

۲- دستور میں شریعت کے قانونی احکام کے نفاذ کے لیے ایک واضح اور مؤثر نظامِ کار کا تعیّن۔ ــــــ دفعہ ۲۲۷ ایک اہم انتظام ہے لیکن اس کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ ایک متعین مدت میں اپنا فرض انجام دے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کے لیے سات سال کی مدت رکھی گئی تھی کہ اس زمانے میں تمام مروجہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کرلیا جائے گا۔ یہ کام آج تک نہیں ہوا ہے۔

---اسی دفعہ کی رُو سے آیندہ کے لیے بھی شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے قانون سازی ضروری ہے اور یہ قانون سازی، اسمبلی اور سینیٹ کو 'اسلامی نظریاتی کونسل' کے مشورے اور معاونت سے کرنا تھی۔ مگر اس باب میں بھی ہمارا قومی ریکارڈ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔

۳- دستور نے شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں دفعہ ۲۲۷ کے ساتھ ایک دوسرا راستہ 'پالیسی رہنما اصول' (باب ۲، دفعہ ۲۹ تا ۴۰) کی شکل میں نکالا۔ جو عدالتوں کے ذریعے نافذ العمل نہیں تھا مگر ہر سال پارلیمنٹ کو کارکردگی کی رپورٹ کی شکل میں اس عمل کو آگے بڑھانا پیش نظر تھا۔ اس سلسلے میں بھی پیش رفت صفر ہی رہی ہے۔

ان تینوں کے عملاً غیر مؤثر ہوجانے کے بعد نفاذِ شریعت کا ایک دوسرا نسبتاً مختصر راستہ عدلیہ کو یہ اختیار دینا تھا کہ خود اپنے ایما یا اختیار (suo moto)، یا کسی کے توجہ دلانے اور استغاثہ کرنے پر کسی قانون کا جائزہ لے کر متعین کرسکے کہ وہ قانون قرآن وسنت کے مطابق ہے یا متصادم، اور تصادم اور عدم تطابق کی صورت میں اسے کس طرح کالعدم کیا جائے۔

یہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ عدالتوں کے جج حضرات بالعموم اس بنیادی علم سے آراستہ نہیں جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہے۔ صحیح راستہ تو یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کے نظام کو، وکلا اور ججوں کی تربیت، انتخاب، ترقی کے اصول وضوابط کو تبدیل کیا جائے۔ ایک ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک معقول مدت میں نیچے سے اُوپر تک جج قانون کے علم کے ساتھ شریعت کا علم بھی رکھتے ہوں اور اخلاق وتقویٰ کے اعتبار سے بھی دینی معاملات میں قوم کے اعتماد کے مستحق ہوسکیں۔ یہ عمل صحیح اور معیاری ہونے کے باوجود وقت طلب تھا۔ اس لیے صدر ضیاء الحق کے دور میں پہلے تمام ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ کے قیام کی تجویز آئی، جسے عدلیہ نے پسند نہیں کیا۔ وفاقی شرعی عدالت کا راستہ اختیار کیا گیا، جس پر ۱۹۸۰ء سے عمل ہورہا ہے اور جس کے لیے دستور میں ایک پورے باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں چند بڑی بڑی خامیاں رہ گئیں:

۱- اس کا دائرۂ کار محدود تھا۔ قوانین کی اکثریت اس کے دائرۂ کار سے باہر تھی۔

۲- یہ صرف قانون یا اس کے کسی حصے پر کلام کرسکتی تھی۔ انتظامی احکام اس کے دائرے سے باہر تھے۔

۳- اس کے ججوں کا تقرر، تبدیلی، تنزلی وغیرہ کے بارے میں ایسے من مانے ضابطے بنائے گئے جو نہ صرف عدلیہ کی آزادی اور اس عدالت کے مستقل وجود کے منافی تھے، بلکہ خود اسلام کے تصورِ عدل کے ساتھ بھی مذاق تھے۔

۴- اسے دادرسی اور عارضی احکام (interim injunctions) کا اختیار حاصل نہ تھا، یعنی یہ عدالت بالکل بے طاقت تھی۔

۵- اس کو صرف حدود کے معاملات میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ باقی اس کا اصل دائرۂ اختیار صرف قوانین کے بارے میں رائے دینے تک محدود تھا۔ غنیمت ہے کہ اتنی گنجایش تھی کہ اگر اس کے دیے ہوئے وقت میں مقنّنہ قانون سازی نہ کرے یا سپریم کورٹ میں اپیل نہ ہو جائے تو کم از کم زیرنظر قانون کا خلافِ شریعت حصّہ معدوم ہو جائے گا۔ گو اس کی نوبت کم ہی آسکی۔

اس طرح نفاذِ شریعت (قانون کے جدید تصور کی حد تک) کے جو جو راستے ہو سکتے ہیں، عملاً دونوں ہی غیرمؤثر رہے۔ اور اس وقت سب سے اہم فیصلہ یہی کرنا ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یا دونوں طریقوں کو بہ یک وقت جاری رکھا جائے۔

دیگر اہم عوامل

نفاذِ شریعت کا عمل محض قانونی عمل نہیں ہے، گو قانونی دائرے میں قانونی مشینری کے ذریعے اس کام کو انجام دینا ازبس ضروری بھی ہے اور اس کے لیے مزید مؤثر اقدامات بھی درکار ہیں۔ اس قانونی عمل کے ساتھ جن دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے ہم ان کی نشان دہی کرتے ہیں:

● **پالیسی سازی اور تقاضے**: اہم ترین چیز قانون کے ساتھ ساتھ پالیسی، پالیسی سازی کے طریق کار، پالیسیوں پر احتساب اور انتظامی احکامات کو بھی عدالتی مواخذے (judicial review) کے لیے کھولنا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے صرف قانون سازی ہی کافی نہیں، بہت بڑا دائرہ پالیسی سازی کا ہے اور اس طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مشینری بھی موجود نہیں ہے۔ ہر وزارت آزاد ہے اور شرعی رہنمائی اور احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک غیرمؤثر مشاورتی ادارہ ہے اور اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تعلق حکومتی مشینری سے

نہیں۔ یہ ایک دُور دراز جزیرے کے طور پر کام کرتا ہے، جب کہ ملک کے پلاننگ کمیشن اور تمام مشاورتی اداروں سے اس کا دستوری، انتظامی اور عملی تعلق (interaction) ہونا چاہیے۔ راقم کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی کی حیثیت سے نفاذِ اسلام کی طرف پیش قدمی اور منصوبہ سازی کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ نظریاتی کونسل کا کوئی ربط کسی پالیسی ساز ادارے سے نہیں اور نہ پالیسی ساز اداروں نے یہ زحمت کی کہ اس ادارے سے کوئی استفادہ کریں۔ ہم نے پلاننگ کمیشن اور نظریاتی کونسل کے مشترک اجتماعات کیے اور ان کی مشترک کمیٹیاں تشکیل دیں، تو معلوم ہوا کہ پالیسی سازی میں اسلام سے راہ نمائی لینے کا عمل کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی لیکن مختصر تجربہ تھا۔

'پاکستان قومی اتحاد' ۱۹۷۸ء کے وسط سے ۱۹۷۹ء کے اوائل تک، چند ماہ کے لیے ضیاء حکومت کا حصہ رہا۔ مگر قومی اتحاد کے حکومت سے نکلنے کے بعد (۱۹۷۹ء) سارا انتظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں: ایک یہ کہ جب تک تمام پالیسی ساز اداروں اور افراد کو عملاً اس کام میں شریک نہ کیا جائے کوئی پیش رفت مشکل ہے۔ دوسرے، یہ کام محض وقتی طور پر نہیں، مستقل بلکہ اداراتی انتظام کی شکل میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سب سے اہم چیز سیاسی اثر و رسوخ، عزم و ارادہ اور جذبۂ عمل (political will) ہے۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نفاذِ اسلام کے عمل کو غیر مؤثر اور غیر نتیجہ خیز کرنے والی چیز اسی سیاسی ارادے کی کمی ہے اور یہ صرف ایک فرد کے عزم کا مسئلہ نہیں، یہ پوری سیاسی مشینری اور اجتماعی قیادت کے ارادے اور عزم کا مسئلہ ہے۔ اور جب تک یہ حل نہ ہوگا، گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

● **تبدیلیِ قیادت**: دوسری اہم ترین ضرورت سیاسی عزم و ارادہ ہے، جس کا اظہار ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب قیادت واقع ہو۔ اب تک کی تمام ہی قیادتوں کا حال (چند انفرادی استثنائی حوالوں کو چھوڑ کر) بڑا ہی مایوس کن رہا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی کی تبدیلی کا آخری انحصار افرادِ کار کی تبدیلی اور انقلابِ قیادت پر ہوگا۔ سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے کی قیادت میں اندر سے تبدیلی آئے یا اسے ایسے افراد سے تبدیل کیا جائے جو اس

میدان میں صحیح قیادت اور نمونہ فراہم کرسکیں۔ اس قیادت کے لیے تین چیزیں ازبس ضروری ہیں:

اول: اس کا اپنا عزم، وژن، کردار اور نمونہ۔

دوم: اس کا علم، تجربہ، صلاحیت کار، مشاورتی نظام اور اعلیٰ کارکردگی۔

سوم: ایک مؤثر نظامِ شوریٰ اور احتساب تاکہ قیادت صحیح راستے پر قائم اور گامزن رہ سکے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مثال سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہے کہ کس طرح ایک ایسے نظام میں جس میں بگاڑ واقع ہوگیا تھا اور قدیم جاہلیّت نے اسلام کی انقلابی اصلاحات کو غیرمؤثر یا معدوم کرکے پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا تھا، انھوں نے ڈھائی سال کے مختصر وقت میں دوبارہ نظامِ حکومت و ریاست کو خلافت راشدہ کی راہ پر ڈالا۔ اور بے نفسی، قربانی، مفاد پرست طبقات پر ضرب اور ریاست کو اس کے اسلامی مقاصد کے لیے دوبارہ منظّم کرنے کا کام انجام دیا۔ اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کر کے، اپنے خاندان اور قبیلے کو لگام دی۔ حق پرستی، اصولوں پر عدم لچک، مظلوموں کی دادرسی، میرٹ کا اہتمام اور نتائج سے بے پروا ہوکر باطل سے سمجھوتوں کی روش سے اجتناب کیا۔ یہ تھا قیادت کا وہ نمونہ جو عمر ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی آج ضرورت ہے۔

• **نظامِ تعلیم و تربیت:** دستور، قانون، پالیسی اور قیادت کے بعد تعلیم و تربیت، مطلوبہ مردانِ کار کی تیاری اور ترغیب و ترہیب کے ایسے نظام کا قیام ضروری ہے جس کے نتیجے میں صحیح افراد ہر سطح پر ذمہ داری کے مقام پر آسکیں۔ لوگوں کو اعتماد حاصل ہو اور وہ نظام پر بھروسا کرنے لگیں۔ جہاں ضروری ہے کہ پہلے قدم پر ہی اس کام کا آغاز کر دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہوگا اسے مستقل مزاجی سے جاری رکھنے کا اہتمام ہو تاکہ فطری انداز میں مناسب نظام الاوقات کے تحت تبدیلی واقع ہوسکے۔

• **راے عامہ کی ہمواری:** اس پورے عمل میں جہاں قانون کی بڑی اہمیت ہے، وہاں افراد اور معاشرے کی ایسی تیاری ضروری ہے کہ لوگ دلی آمادگی اور خوش دلی سے شریعت کے نفاذ کے عمل میں شریک ہوں۔ یہ کام نہ محض وعظ سے ہوسکتا ہے اور نہ صرف جبر اور ڈنڈے کی قوت سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ نفاذِ شریعت کا ہمیں سکھایا ہے اور جس کا نمونہ

آپؐ نے پیش فرمایا ہے۔ اس کا نمایاں خاصہ، دل اور ذہن کی تبدیلی اور اخلاق و کردار کے انقلاب کے ساتھ، قانون اور حکومت کی انتظامی اور تادیبی قوتوں کا متوازن اور حسین امتزاج ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے ہر دور میں ان دونوں دھاروں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا ضروری ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے اور اس میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ یہ مقصد پابندیاں لگانے اور ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آزادی، اختلاف اور رواداری کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آمریت اور استبداد کی فضا میں یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو حقوق کا احترام، فرائض کی ادایگی کا جذبہ، شوریٰ کی فضا، نیکیوں میں مسابقت کا شوق، ایک دوسرے کے لیے احترام، ایثار، قربانی اور باہم معاونت درکار ہے تاکہ گرتوں کو تھاما جاسکے اور بے راہ روی کا شکار ہو جانے والوں کو سینے سے لگا کر جہنّم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچایا جاسکے۔ معاشرے میں یہ فضا اور یہ جذبہ پیدا کرنا بھی نفاذِ شریعت کا لازمی حصّہ ہے۔

● **مقاصدِ شریعت کا تحفظ**: یہ پورا کام جس ذہن اور جذبے سے ہونا چاہیے وہ وہی ہے جس کا نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، یعنی دنیا میں انسانوں کے درمیان انصاف اور حقوق العباد کی ادایگی، اور اصل منزل آخرت کی کامیابی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا حصول۔ شریعت کے احکام و ضوابط کو مقاصدِ شریعت کو نظرانداز کر کے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ مقاصد بہت واضح ہیں یعنی: ● دین و ایمان کا تحفظ ● جسم و جان کی حفاظت ● اخلاق، عصمت، خاندان اور نسلِ انسانی کا تحفظ ● عقل و شعور کی حفاظت اور ● مال کا تحفظ۔ انھی کے قیام سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔

یہ بڑی معنی خیز حقیقت ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون میں جن حدوں کے تحفظ کو قرآن وسنت نے سزاؤں کے تعین کے ساتھ طے کردیا وہ یہی پانچ مقاصد ہیں۔ دنیا کے دوسرے تعزیری قوانین میں سیکڑوں نہیں ہزاروں جرائم اور ان کی سزائیں ہیں، لیکن اسلام نے جن جرائم اور ان کی سزاؤں کو حدود کا مقام دیا وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ دین و ایمان کی حفاظت کے لیے ارتداد کی سزا کی حد، جسم و جان کے تحفظ کے لیے قصاص و دیت کا قانون، اخلاق، خاندان، عزت و عصمت اور

نسل کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف کی حدود، عقل کے تحفظ کے لیے تحریمِ خمر اور شراب کی حد اور مال کے تحفظ کے لیے سرقہ اور حرابہ کی حدود ___ یہ حدود محض سزائیں نہیں، یہ تو شریعت کے اصل مقاصد اور انسانی معاشرے کی اصل بنیادوں کے تحفظ کا نظام ہیں۔ مقصد سزا دینا نہیں، مقصد ان بنیادوں کا تحفظ، ان کی مضبوطی اور انسانی زندگی کو عدل و انصاف اور عزت و خوش حالی کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے۔

نفاذِ شریعت کے یہ ہیں وہ تمام پہلو، جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور مل کر ایک نامیاتی کُل (organic whole) بناتے ہیں۔ نفاذِ شریعت کے عمل کو ان سب کا احاطہ کرنا چاہیے، ورنہ وہ نامکمل اور غیر مؤثر رہے گا۔ اس مقصد کے لیے تمام اہلِ وطن کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔

علی احسن محمد مجاہد، صلاح الدین قادر چودھری

شہادتِ حق سے جامِ شہادت تک

سلیم منصور خالد

آج ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے۔

گزری رات میں حکمرانوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ: ''بھارتی جارحیت اور قومی غداری کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جائیں''۔ اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ کے دفتر کے آس پاس جمعیت اور البدر کے کارکن اکٹھے ہیں۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا۔ ساڑھے ۲۳ برس کا ایک نوجوان، اپنے چاروں طرف کھڑے ساتھیوں کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ اگرچہ چند سسکیاں سنائی دے رہی ہیں، مگر وہ نوجوان پوری خوداعتمادی سے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں سے مخاطب ہوتا ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَo

مجاہد ساتھیو!

ہمارے جسم و جان صرف اور صرف اسلام کے لیے ہیں۔

ہم نے اسلام ہی کی خاطر وہ کردار ادا کیا، جسے ہم خدا کی کتاب اور سنتِ رسولؐ کے مطابق درست جانتے تھے۔ ہم نے پاکستان کو معبود سمجھ کرنہیں، مسجد سمجھ کر اپنے سروں کی فصل اور اپنے مستقبل کو اس پر نچھاور کیا ہے۔

ہمیں اس بات کی کوئی پروانہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے اس کردار کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ جسے قبول کرنا ہے وہ تو جانتا ہی ہے کہ ہمارے سامنے صرف اس کی مرضی تھی۔

یہ خدا کی مرضی تھی کہ ہم سربکف نکل کھڑے ہوں۔ آزمایش کی اس گھڑی میں ہم نے اسی سے مدد مانگی اور اسی کے بھروسے پر اس نازک گھڑی سے نمٹنے کی کوشش کی۔

اے مظلوم پاکستان کے مجبور بیٹو!

ہمارے ساتھ آج جو کچھ ہونے والا ہے، ہم گزرے ہوئے کل میں اُس سے واقف تھے اور آج ہم اُس سے بھی واقف ہیں جو آنے والا کل ہمارے لیے لے کر آئے گا۔

ہم نہ اپنے گزرے ہوئے دنوں پر شرمندہ ہیں اور نہ آنے والے کل سے مایوس ہیں۔

آزمایش خدا کی سنت ہے اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ آزمایش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ لیکن، جب وہ مسلط ہوجائے تو سرخروئی کی دُعا اور کامرانی کی اُمید کے ساتھ خدا کے حضور جھک جانا چاہیے۔

آج کا سورج ایک کڑے امتحان کے ساتھ طلوع ہوا ہے اور آنے والا کل دہکتے انگاروں کی بارش کے ساتھ نمودار ہونے والا ہے۔ ہمیں اللہ کی رضا پر راضی رہنا ہے اور ان آزمایشوں سے ایک صاحبِ ایمان جیسے عزم اور صبر کے ساتھ گزرنا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اس راہ میں جان دے دینا وہ عظیم ترین سعادت ہے، جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا اپنے رب سے اپنی جانوں کے عوض جنت کا سودا کرنے سے پہلے ہم نے خوب سوچ سمجھ نہیں لیا تھا؟

آزمایش کی یہ گھڑی اُس ابدی دنیا کی کامرانیوں کی بشارت بھی ہے۔ اس لیے ان کڑی ساعتوں کا سامنا ایمان، عزم اور استقلال کی دُعا سے کیجیے کہ ایمان اور عزم کو کبھی فنا نہیں۔

اے دنیا بھر کی کامرانیوں سے بڑھ کر عزیز دوستو!

آپ آج بھی وقت کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اقامتِ دین، شہادتِ حق اور اسلامی انقلاب کے لیے ان زندگیوں کی حفاظت آپ پر فرض ہے۔

اگر آپ کے گھروں کی دہلیزیں آپ کے لیے بند اور راحت کدوں کی وسعتیں آپ کے لیے تنگ کردی جائیں تو ہجرت کر جایئے کہ ہجرت، وفا کے راستے کا لازمی سفر ہے۔ ہجرت خدا کے آخری رسولؐ کی سنت ہے۔

ہجرت کی تکلیفوں اور اذیتوں میں قرآن، نماز اور سیرتِ رسولؐ و سیرتِ صحابہؓ سے روشنی حاصل کیجیے کہ زندگی کا ظلمت کدہ انھی سے منور ہو سکتا ہے۔

—— اور مت بھولیے، آپ ہی روشنی کے امانت دار ہیں۔ قرآن، سیرت اور کردار روشنی ہے، جہاں بھی رہیے اسی کے چراغ روشن کیجیے۔

اے میرے بھائیو!

کسے معلوم کہ کل ہم میں سے کون زندہ رہے اور کون کس سے مل پائے؟ وہاں تو ملاقات یقیناً ہوگی، مگر اِس دنیا میں بکھر جانے سے پہلے ان چہروں کو جی بھر کر دیکھ لو، اور ان سینوں سے آخری بار معانقے کر لو کہ شاید یہ سب ایک بار پھر یہاں اس طرح جمع نہ ہوسکیں، سوائے اس کے کہ ہمارا رب چاہے، اور وہ چاہے تو ہم یہاں پھر بھی مل سکتے ہیں۔

ساتھیو، دوستو اور بھائیو!

اب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے۔

اپنے حواس مجتمع کیجیے، اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

آئیے! ہم ایک دوسرے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں، فی امان اللّٰہ!

ایک طرف ہتھیار ڈالنے کی تیاری ہو رہی تھی اور دوسری جانب یہ خطاب۔ خطاب ختم ہونے پر البدر کے کیڈٹ بھیگی پلکوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سب ساتھی اپنے قائد کو پہلے الوداع ہونے پر اصرار کر رہے تھے، مگر وہ اس بات پر چٹان کی طرح جم گیا کہ: ''میں آخری فرد ہوں، جو آپ سب کے روانہ ہونے کے بعد اس جگہ سے ہلے گا''۔ اصرار بڑھا تو اس نوجوان نے کہا: ''دوستو، میں مجبوراً آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ ہجرتوں پر چلے جائیے''۔ اور تمام مجاہد اَن دیکھی راہوں پر چل نکلے۔

یہ نوجوان اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کے آخری ناظم شہید علی احسن محمد مجاہد تھے، جو قیامِ پاکستان کے ۱۰ ماہ بعد ۲۳ جون ۱۹۴۸ء کو فرید پور میں پیدا ہوئے۔ وہ ڈھاکہ یونی ورسٹی کے طالب علم تھے۔ انھیں ۲/اکتوبر ۱۹۷۱ء کو اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ تسنیم عالم منظر (م: ۱۵ستمبر ۱۹۷۲ء) نے مشرقی پاکستان میں جمعیت کا صوبائی ناظم مقرر کیا تھا۔ یاد رہے علی احسن

'البدر' کے صوبائی کمانڈر نہیں تھے۔

اپنی تحریر میں، 'مَیں' کا لفظ استعمال کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ لیکن آج یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے اس تقریر کے اجزا ان دوستوں سے مل کر قلم بند کیے، جوان کرب و بلا کے لمحوں میں یہ تقریر سن رہے تھے۔ پھر دسمبر ۱۹۸۰ء میں ڈھاکہ پہنچ کر علی احسن محمد مجاہد بھائی کو یہ تقریر سنائی۔ یہ تقریر سناتے ہوئے جب ایک ایک جملے پر لرزتے ہوئے جملہ زبان سے ادا کرنے میں بے بس ہوجاتا تو علی احسن بھائی مجھے سینے سے لگا کر، اپنے ہاتھ سے میرے آنسو پونچھتے۔ میں حیران تھا کہ علی احسن بھائی کا ملکوتی چہرہ پُرسکون انداز سے اپنے اندر چھپے طوفان کو کس ضبط سے سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ تقریر میری مرتّبہ کتاب البدر میں اکتوبر ۱۹۸۵ء (ص ۱۷۶-۱۷۸) میں شائع ہوچکی ہے۔ کالی دیوی اور سزاے موت دینے والے ٹریبونل نے اس تقریر کو بھی فردِ جرم (چارج شیٹ) کا حصّہ بنایا تھا۔ یہ تقریر زمان و مکان کی قید ختم کرتی، ہمیں ڈھاکہ سے اُٹھا کر ۱۴۰۰ برس پہلے میدانِ بدر میں لے جاتی ہے۔ اس تقریر میں علی احسن کے ایمان، اعتماد اور مستقبل بینی کو اس طرح دیکھا جاسکتا ہے کہ جیسے سورج کی روشنی میں اپنے ہاتھ کی لکیریں!

○

سرزمینِ پاکستان پر علی احسن مجاہد کی ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح ڈھاکہ میں اس آخری تقریر کو، بنگلہ دیش میں ۲۲ نومبر ۲۰۱۵ء کی رات ۱۲ بج کر ۵۵ منٹ پر ڈھاکہ ہی میں الوداعی خطاب سمجھ کر، دوبارہ پڑھا، سمجھا اور لفظ لفظ پر خوب غور کیا۔ بقول نعیم صدیقی مرحوم:

میرے خیال میں آتے ہیں جب وطن کے شہید
تو سوچتا ہوں کہ اپنی یہ زندگی کیا ہے
سنا تھا خونِ شہیداں سے پھوٹتی ہے سحر
تو میرے گرد یہ دیوارِ تیرگی کیا ہے

کل کا مشرقی پاکستان آج کا بنگلہ دیش ہے۔ کل جہاں کُل ہند مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور سب سے پہلے دوقومی نظریہ مجسم صورت میں اُبھرا تھا، آج وہ اسی برہمنی سامراج کے خونیں پنجوں میں پھڑ پھڑاتے پرندے کے مانند ہے۔ جہاں بھارت نے عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن

(م:۱۵/اگست ۱۹۷۵ء) کی مدد سے نہ صرف پاکستان توڑا بلکہ خود اپنی قوم کو ایک ایسی غلامی کی دلدل میں دھکیلا تھا، جہاں آج علامتی طور پر بنگلہ دیش کا پرچم تو موجود ہے اور کہنے کو، ایک بنگالی حکومت بھی، مگر عملاً اس کا اقتدارِ اعلیٰ بھارتی بدنامِ زمانہ 'را' کے ڈائرکٹریٹ کے ہاتھ میں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک دوسرے شیخ، شیخ عبداللہ (م: ۸ستمبر۱۹۸۲ء) نے بظاہر کشمیر کا اختیار حاصل کرنے کا ڈراما رچایا، لیکن اہلِ کشمیر آج بھی اسی برہمنی سامراج کے شکنجے میں قربانیاں دے رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل علی احسن محمد مجاہد شہید کا جرم کیا تھا؟

اگر واقعی وہ اُن جرائم کے مرتکب تھے، جنھیں 'را' کے اہل کاروں نے مرتب کیا ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے 'مجرم' کو خود اُس کے علاقے کے لوگوں نے کیوں ۴۳ برس تک اپنے درمیان قبول کیا؟ کیوں اُس کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا؟ کیوں اسے رکنِ اسمبلی منتخب کیا؟ کیوں اسے بطور 'وزیر سماجی بہبود' (۲۰۰۱ء-۲۰۰۷ء) کام کرنے دیا؟ کیوں عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمٰن کے دورِ اقتدار ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ء اور بعدازاں حسینہ واجد کے پہلے دورِ حکومت میں مقدمہ نہ چلایا؟___ اس المیے کا واحد جواب یہ ہے کہ وہ ایسے کسی جرم میں شریک نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو جنرل حسین محمد ارشاد کے دورِ آمریت (دسمبر ۱۹۸۳ء- دسمبر ۱۹۹۰ء) میں جمہوریت کی بحالی اور دستوری ترامیم کے لیے عوامی لیگ ان کے ساتھ اتحاد میں شامل ہوکر جدوجہد نہ کرتی۔

اب ذرا دیکھیے: علی احسن مجاہد کو ۲۹ جون ۲۰۱۰ء کو گرفتار کیا گیا، ۱۶جنوری ۲۰۱۲ء کو چارج شیٹ مرتب کی گئی۔ ۲۱ جون ۲۰۱۲ء کو الزامات متعین کر کے نام نہاد ٹریبونل میں پیش کیے گئے۔ سوال یہ ہے کہ پورے ۱۹۷۱ء میں، اور پھر ۱۶دسمبر ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۶جنوری ۲۰۱۲ء کے درمیانی عرصے میں علی احسن مجاہد کے خلاف کسی تھانے میں ان جرائم کی نسبت سے ایک سطر بھی درج نہیں، اور نہ کسی عدالت میں مذکورہ کسی الزام پر مبنی کوئی ایک مقدمہ بھی زیرِسماعت ہوا۔ پھر یہ سب اچانک کیوں ہوا؟

اس جعلی عدالت نے، جسے دنیا بھر میں انسانی حقوق کے عالمی اداروں اور عدالتی عمل کے پاسداروں نے کھلے لفظوں میں مسترد کر دیا ہے، اسی عدالت نے ۱۷جولائی ۲۰۱۳ء کو علی احسن مجاہد کو سزاے موت سنائی۔ علی احسن نے اُسی وقت عدالت کی کرسی پر بیٹھے نام نہاد جج کو مخاطب کر کے کہا تھا: 'یہ سب جھوٹ ہے اور تمھارا فیصلہ بھی جھوٹ ہے، سوفی صد جھوٹ'۔ ازاں بعد سپریم کورٹ میں

اپیل کی، جو ۱۶ جولائی ۲۰۱۵ء کو مسترد ہوگئی۔ پھر ۱۸ نومبر کو اسی عدالت نے نظر ثانی کی درخواست بھی خارج کر دی، اور ۲۱، ۲۲ نومبر کی درمیانی رات سچائی کا قتل کر دیا گیا۔

ہمیں اس وحشت انگیزی کے پس منظر میں کارفرما محرکات کو دیکھنا چاہیے جو بین الاقوامی اور سیاسی، معاشی اور تہذیبی ایجنڈے کے حامل ہیں۔ اس میں اوّلین محرک تو اسلامی تہذیبی رشتے پر حملہ ہے، اور دوسرا فوری سبب بھارت کے معاشی مفادات کا تحفظ ہے۔ غور کیجیے کہ: ''آج بنگلہ دیش میں ۵ لاکھ بھارتی کارکن کام کر رہے ہیں۔ (اور بنگلہ دیش، بھارت کے ایک صوبے اتر پردیش سے بھی چھوٹا خطہ ارضی ہے، جہاں غربت اور بے روزگاری کے وہ ہولناک ڈیرے ہیں، مگر) عرب امارات، امریکا، سعودی عرب اور برطانیہ کے بعد جس ملک سے سب سے زیادہ زرمبادلہ بھارت منتقل ہوتا ہے، وہ یہی 'آزاد' بنگلہ دیش ہے (طیب حسین، ڈیلی اسٹار، ۸ مارچ ۲۰۱۵ء)۔ قبل ازیں یہی بات ڈھاکہ کا اخبار دی نیونیشن (۲۸ فروری ۲۰۱۴ء) لکھ چکا ہے۔ دونوں اخبارات بتاتے ہیں کہ: ''بنگلہ دیشی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳ء۷۱۶ ملین امریکی ڈالر سے زیادہ زرِمبادلہ بنگلہ دیش سے بھارت کی طرف بہہ جاتا ہے، جب کہ اس سے دوگنی رقم غیر قانونی ہنڈی کے ذریعے بھارت منتقل ہوتی ہے [گویا کہ تقریباً ۸ ارب امریکی ڈالر جو ۶ کھرب اور ۲۴ ارب بنگلہ دیشی روپے (ٹکے) بنتے ہیں]۔ اس رقم کا بڑا حصّہ تجارت، صنعت اور بنگلہ دیش میں کام کرنے والی این جی اوز میں بھارتی کارندوں کی تنخواہوں کی صورت میں بھارت منتقل ہوتا ہے'' (ذرا یہاں پاکستان میں متحرک مخصوص نظریاتی 'این جی اوز' پر نظر ڈال کر دیکھیے، کچھ نہ کچھ 'طبق ضرور روشن' ہوں گے)۔

نکتے کی یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ ایک طرف بنگلہ دیش کی جماعت اسلامی، اس بھارتی معاشی یلغار اور غلامی کے سامنے رکاوٹ کھڑی کر رہی تھی اور دوسری طرف عالمی شہرت یافتہ صحافی اور بنگلہ دیش کے پہلے وزیر خارجہ ڈاکٹر کمال حسین کے داماد ڈیوڈ برگ مین کے بقول: ''بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی (بی این پی) کے مرکزی رہنما صلاح الدین قادر چودھری کا اصل جرم یہ تھا کہ انھوں نے ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۷ء کے دوران، بطور مشیر پارلیمانی اُمور یہ دیوار کھڑی کر دی تھی کہ ہم بھارت کے ٹاٹا گروپ کو بنگلہ دیش میں ۳ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری نہیں کرنے دیں گے، اور وہ اس میں کامیاب رہے''۔ (دیکھیے Progress Bangladesh، ۲۱ نومبر ۲۰۱۵ء)

اگرچہ دیگر نظریاتی، سیاسی اور عالمی اہمیّت کے اُمور بھی اس اہتمامِ قتلِ بہاراں میں شامل ہیں، مگر بنیادی طور پر بھارت نے جب یہ دیکھا کہ اس کی معاشی چراگاہ بنگلہ دیش میں رکاوٹیں کھڑی ہورہی ہیں تو اس نے ۱۹۷۱ء کے بعد دوسری بار ۲۰۰۸ء سے میں بنگلہ دیشی معاشرے کو خونیں تصادم میں دھکیلنے کے لیے عوامی لیگ سے مدد مانگی، اور آج یہ سارا کھیل، کسی بنگلہ دیشی قومی مفاد میں نہیں بلکہ بھارت کے معاشی اور سیاسی مفاد میں کھیلا جارہا ہے۔ بھارت کے پالیسی ساز اِس طرح مسلسل سیاسی آویزش پیدا کرکے، مقامی سطح پر معاشی استحکام کی بنیادوں کو ہلا مارنے اور لوگوں کو باہم لڑانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر نریندرا مودی جیسے دہشت گرد کی برہمنی یلغار اس فساد میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

صلاح الدین قادر چودھری (جو ۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء کو چٹاگانگ میں پیدا ہوئے) کے والدِ گرامی فضل القادر چودھری (۲۶ مارچ ۱۹۱۹ء-۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء) چٹاگانگ سے تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما اور قائداعظم کے دستِ راست تھے۔ وہ نوجوانی سے لے کر آخری سانس تک صرف مسلم لیگ ہی سے وابستہ رہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد مکتی باہنی نے انھیں گرفتار کرکے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی 'پاکستان مُردہ باد' کا نعرہ بلند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور آخری روز ان کو خنجر مار کر شہید کردیا گیا۔ انھی فضل القادر چودھری شہید کے بیٹے صلاح الدین قادر چودھری نہ صرف بنگلہ دیش کی مسلم قومی شناخت کے علَم بردار تھے، بلکہ بھارت کے معاشی و سیاسی مفادات کے سامنے ایک مضبوط چٹان بھی تھے، اس لیے انھیں نشانہ بنایا گیا ہے۔

صلاح الدین قادر شہید کو ۱۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کی رات گرفتار کیا گیا۔ ۱۴ نومبر ۲۰۱۱ء کو چارج شیٹ جاری کی گئی اور ۴/اپریل ۲۰۱۲ء کو یہ چارج شیٹ نام نہاد خصوصی عدالت میں پیش کی گئی۔ حکومت نے ان کے خلاف ۴۱ خانہ زاد گواہ پیش کیے، لیکن ان جعلی گواہوں کے جواب میں صلاح الدین قادر نے ۲۰ گواہوں کی فہرست پیش کی، جن میں سے صرف پانچ گواہوں کو پیش کرنے کی اجازت مل سکی۔ پھر چار گواہان کو مختصر ترین وقت میں سننے کے بعد پانچویں گواہ کو سننے سے انکار کردیا گیا۔ صلاح الدین نے ۱۹۷۱ء کے حوالے سے alibi (موقع واردات پہ عدم موجودگی) کے آٹھ گواہوں کے نام پیش کیے تو ان ناموں کی فہرست کو صرف پانچ منٹ کی سماعت کے بعد مسترد کردیا گیا۔ پھر پاکستان کے

سابق قائم مقام صدر اور سابق وزیراعظم محمد میاں سومرو، سابق وفاقی وزیر ریلوے اسحاق خاں خاکوانی، روز نامہ ڈان کی چیف ایڈیٹر عنبر ہارون سہگل، منیب ارجمند خاں اور ریاض احمد جیسی قابلِ احترام شخصیات نے حلفیہ یہ گواہی دینے کے لیے ڈھاکہ جانا چاہا کہ: ''صلاح الدین قادر ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں تھے'' تو اُن افراد کے بنگلہ دیش میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ معززین اس بات کے گواہ ہیں کہ صلاح الدین قادر، ۲۹ مارچ سے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک مغربی پاکستان کے شہروں لاہور اور کراچی میں مقیم تھے، مگر اس نام نہاد خصوصی عدالت نے ایک نہ سنی، ایک گواہ کو بھی پیش نہ ہونے دیا۔

یوں ایک جعلی عدالت نے، جعلی مقدمے کی، جعلی کارروائی کا ڈراما رچا کر یکم اکتوبر ۲۰۱۳ء کو صلاح الدین قادر چودھری کو سزاے موت سنا دی۔ ۲۹ جولائی ۲۰۱۵ء کو سپریم کورٹ نے فیصلہ برقرار رکھا اور ۱۸ نومبر ۲۰۱۵ء کو نظرثانی کی اپیل مسترد کر دی۔ ۱۹۷۹ء سے ۲۰۱۲ء کے عرصے میں، چٹاگانگ سے چھے مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے والے صلاح الدین قادر ۲۱، ۲۲ نومبر کی درمیانی رات، حسینہ واجد کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔

جوں ہی ۱۸ نومبر کو دونوں رہنماؤں کی اپیلیں سپریم کورٹ نے مسترد کر دیں، تو ۱۹ نومبر کو انسانی حقوق کے عالمی ادارے 'ہیومن رائٹس واچ' (HRW) نے علی احسن محمد مجاہد اور صلاح الدین قادر چودھری کے لیے اس سزا پر ردعمل دیتے ہوئے یہ بیان دیا تھا: ''جماعت اسلامی کے علی احسن محمد مجاہد اور بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے صلاح الدین قادر کی سزاے موت کے اعلانات کو [بنگلہ دیشی] حکام فی الفور معطل کریں اور ان فیصلوں کو غیر جانب دارانہ نظرثانی کے عمل سے گزاریں۔ بلاشبہہ ۱۹۷۱ء کے حوالے سے نازک اُمور کی جانچ ہونی چاہیے، مگر مقدمات کو انصاف کے عالمی، مسلّمہ اور عادلانہ معیارات کے مطابق چلانا چاہیے۔ مقدموں کی غیر عادلانہ کارروائی سے کبھی انصاف حاصل نہیں ہوسکتا اور خاص طور پر جب سزاے موت دیے جانے کا معاملہ ہو تو مسئلے کی نزاکت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہیومن رائٹس واچ، سابق امریکی سفیر اسٹیفن رپ کے اس بیان کو وزن دیتا ہے کہ مجاہد اور چودھری کے مقدموں پر فیصلہ درحقیقت اسقاطِ عدل (miscarriage of justice) ہے۔(ڈیلی اسٹار، ۲۰ نومبر ۲۰۱۵ء)

علی احسن محمد مجاہد کے بیٹے نے ۱۹ نومبر ہی کو اعلان کر دیا تھا کہ: ''ہمارے عظیم والد نے اپنی ساری زندگی میں کوئی اخلاقی یا فوج داری جرم نہیں کیا ہے۔ وہ بے گناہ ہیں، انھیں صرف حق گوئی، دین داری کی سزا دی گئی ہے، اس لیے وہ رحم کی کوئی اپیل نہیں کریں گے''۔ دوسری طرف کٹھ پتلی حسینہ حکومت نے ۲۱ نومبر کی سہ پہر سے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ: ''دونوں لیڈروں نے صدر سے رحم کی اپیل کی ہے''۔ ایک جانب ان مظلوموں پر ظلم کی انتہا اور دوسری جانب انھیں پھانسی دینے سے قبل نمک پاشی کے لیے یہ گھناؤنا مذاق۔ بہرحال جوں ہی رات کے سایے گہرے ہوئے تو ڈھاکہ اور تمام بڑے شہروں میں بڑی تیزی کے ساتھ پولیس اور بنگلہ دیش ریپڈ بٹالین نے پوزیشنیں سنبھالنا شروع کر دیں۔ دونوں لیڈروں کے اہلِ خانہ کو آخری ملاقات کا نوٹس دیا گیا۔ الوداعی ملاقات کے بعد علی احسن کے بیٹے نے جیل کے گیٹ پر حکومتی پروپیگنڈے کو مسترد کرتے ہوئے بیان دیا: ''جب ہمارے والد نے جرم کیا ہی نہیں تو معافی کی اپیل کیسی؟'' اور صلاح الدین قادر کے بیٹے ہمام قادر نے جیل سے باہر نکل کر بتایا: ''ہمارے والد نے کوئی جرم نہیں کیا، اس لیے انھوں نے کسی سے رحم کی اپیل نہیں کی''۔

'بی ڈی نیوز ۲۴' کے نمایندے کو پھانسی گھاٹ پر آخری لمحوں کے گواہ پولیس افسر نے بتایا: ''پھانسی کے تختے پر قدم رکھتے وقت صلاح الدین قادر اور علی احسن مجاہد، دونوں ہی نہایت پُرسکون تھے۔ ان دونوں کو پھانسی کے ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا''۔ اور ڈپٹی کمشنر کے بقول: ''دونوں خاموشی سے پھانسی کے پھندے کی جگہ جا کر کھڑے ہوئے۔ جب ان کی گردنوں میں رسہ ڈالا جا رہا تھا، تو دونوں نے لمحے بھر کے لیے بھی گردن ہلا کر کسی منفی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور پھر ایک ہی لمحے میں دونوں کو (بنگلہ دیش کے وقت کے مطابق رات ۱۲ بج کر ۵۵ منٹ، پاکستان میں رات ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر) تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا''۔ (۲۲ نومبر، صبح ۶ بجے، بی ڈی نیوز ۲۴)

دونوں قائدین کے عدالتی قتل کی اگلی صبح حسینہ واجد نے بڑی خوشی کے ساتھ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کی تو چٹاگانگ سے عوامی لیگی ممبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ''حسینہ نے پھانسیاں دے کر عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، یہ ٹوٹ تو سکتی ہے، مگر جھک نہیں سکتی'' (بی ڈی نیوز، ۲۲ نومبر)۔ پاکستان کے وزیرداخلہ چودھری نثار علی خاں نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے

ہوئے کہا: ’’یہ سزاے موت دراصل انصاف کا قتل، اخلاقیات، عالمی قوانین اور انسانی حقوق کی پامالی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکے‘‘۔ جس کے جواب میں: ’’کٹھ پتلی وزیراعظم حسینہ واجد نے کابینہ کا اجلاس شروع ہوتے ہی، پھانسیوں پر خوشی کا اظہار کیا اور بنگلہ دیشی برقی ذرائع ابلاغ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا کہ انھوں نے علی احسن مجاہد اور صلاح الدین قادر کے خاندانوں اور پس ماندگان کے دکھ درد کو کیوں سکرین پر پیش کیا ہے‘‘۔ (ڈیلی اسٹار، ۲۳ نومبر، شام ۴ بجے)

اگرچہ دنیا بھر میں اس ظلم پر شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے، تاہم ۴۰ ممالک کے علما کی عالمی تنظیم 'رابطہ علماے اہلِ سنت' استنبول نے اپنے مذمتی بیان میں کہا ہے: ’’بنگلہ دیش میں حکومت غیرانسانی، غیرقانونی اور غیراسلامی اقدامات کرتے ہوئے محبِّ وطن افراد اور تحریکِ اسلامی کے قائدین کے خلاف انتقامی رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صلاح الدین قادر اور علی احسن محمد مجاہد کا خون تمام مسلم ممالک، اسلامی تنظیموں اور پوری ملتِ اسلامیہ کی گردن پر ہے، جنھوں نے اس عرصے میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ہم ہر صاحبِ فکر اور ہر ذمہ دار فرد سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بنگلہ دیش کے ان مظلوم مسلمان بھائیوں کی معاونت کے لیے ہر ممکن اقدام کریں‘‘۔ (الجزیرہ نیٹ، ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء)

۲۲ نومبر کو پورے بنگلہ دیش کے بڑے شہروں اور قصبوں میں دونوں شہیدوں کی نمازِ جنازہ میں لاکھوں افراد نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مقررین نے کہا: ’’ان شہیدوں کا کوئی قصور نہیں تھا، سب الزامات بدنیتی پر مبنی تھے، تاکہ بنگلہ دیش کو ایک خودمختار اسلامی اور معاشی اعتبار سے مستحکم ملک بننے سے روکا جاسکے۔ دشمن بھارت یہ دونوں باتیں ہضم نہیں کرسکتا، اس لیے اُس کی آلۂ کار اور غیرنمایندہ عوامی لیگی حکومت بھارت کی خوش نودی کے لیے اپنے ہی بیٹوں کے خون کی ہولی کھیل رہی ہے۔ جماعت اسلامی پہلے بھی معاشرے کی اصلاح، ترقی اور خودمختاری کے لیے کام کر رہی تھی، ہم آیندہ بھی اسے بھارتی غلامی سے بچانے کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ یہ شہادتیں ہمارا راستہ روک نہیں سکتیں، بلکہ ہمیں ان سے اور زیادہ یکسوئی حاصل ہوئی ہے۔ ایک بندۂ مومن کی زندگی کا مقصد صرف اسی کی رضا ہے۔ ہم اپنی جدوجہد پُرامن، دعوتی اور جمہوری انداز سے جاری رکھیں گے‘‘۔

۲۳ نومبر کو جماعت اسلامی نے پورے بنگلہ دیش میں احتجاجی ہڑتال کی اپیل کی۔ کئی شہروں

میں بھرپور ہڑتال رہی، تاہم ہڑتال کو روکنے کے لیے، جماعت اسلامی اور 'اسلامی چھاترو شبر' (اسلامی جمعیت طلبہ) کے رہنماؤں کے گھروں کو (بھارت میں بجرنگ دل، شیوسینا اور آر ایس ایس کے فسادیوں کی طرح) رات ہی سے عوامی لیگی غنڈوں نے گھیر لیا، تاکہ مؤثر احتجاج کو روکا جاسکے۔ متعدد کارکنوں کو گھروں سے نکلتے ہی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور سیکڑوں کو گرفتار کرلیا۔ کئی رہنماؤں کے گھروں کے سامنے لاؤڈ اسپیکر پر اعلانات کیے جاتے رہے: ''تم گھروں کو خالی کرو، اور بنگلہ دیش چھوڑ دو''۔ جیسور کالج ہاسٹل میں اسلامی چھاترو شبر کے دو لیڈروں حبیب اللہ اور قمرالحسن کو لاٹھیاں مار مار کر شہید کردیا اور باقی کا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ ہڑتال کو ناکام بنانے کے لیے پوری ریاستی مشینری کو استعمال کیا گیا۔ تاہم، جماعت اسلامی کی جانب سے ہڑتال کی اس اپیل میں بی این پی شامل نہیں ہوئی، حالانکہ صلاح الدین قادر چودھری بی این پی کے مرکزی لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنے اہلِ خانہ سے ۲۰ نومبر کی ملاقات میں اپنی پارٹی کے اس رویے پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ''مجھے افسوس ہے، بی این پی نے یک جہتی کا مظاہرہ نہیں کیا''۔ اور اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ: ''آپ آیندہ جماعت اسلامی ہی کے ساتھ مل کر کام کریں''۔

بنگلہ دیشی وزیرقانون انیس الحق نے ۲۴ نومبر کو کہا ہے کہ: ''جماعت اسلامی اور اس کی متعلقہ پارٹیوں پر جامع پابندی کے لیے، حکومت انتظامی حکم نامہ جاری کرنے کے بجاے باقاعدہ دستوری ترمیم پر کام کر رہی ہے، اور 'خصوصی عدالت' سے فیصلہ لینے کے لیے ریفرنس دائر کر رہی ہے تاکہ جماعت اسلامی، اس کی برادر اور اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی تنظیموں پر بنگلہ دیش میں مستقل طور پر پابندی عائد کردی جائے''۔ دوسری جانب ۲۵ نومبر کو وزارتِ خزانہ نے بنک آف بنگلہ دیش سے کہا کہ: ''جماعت اسلامی اور اس سے وابستہ تنظیموں، اور منسلک افراد کے بنکوں، انشورنس کمپنیوں، جایداد خرید و فروخت کے اداروں، ہسپتالوں، کلینکوں، اسکولوں اور تدریسی اداروں کے لین دین پر کڑی نگاہ رکھ کر رپورٹ مرتب کی جائے، تاکہ مالیاتی پابندی کو مؤثر بنایا جاسکے''۔

بہ ظاہر حالات سخت خراب ہیں اور سیکولر فسطائیت کی گرفت بھی نظر آتی ہے۔ مگر ان شاء اللہ ظلم کی یہ سیاہ رات زیادہ طول نہیں کھینچ سکے گی۔